بشیر احمد ڈار

عیسائی تصوّف

(۳)

آگسٹائن

عیسائی تصوف کی دوسری اہم شخصیت آگسٹائن ہے۔ وہ ۳۵۴ عیسوی میں شمالی افریقہ کے ایک شہر ٹاگاسٹ میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں مونیکا عیسائی تھی اور اس زمانے کے عام ماحول کے مطابق اس نے انتہائی پرہیزگاری سے زندگی گزاری۔ لیکن اس کا باپ عیسائی نہیں تھا مگر اس نے آگسٹائن کی تعلیم کے لیے پوری پوری کوشش کی۔ اس نے خطابت (RHETORIC) میں خصوصیت پیدا کی۔ رومی نظام حکومت میں اس مضمون کی وہی اہمیت تھی جو آج کل مثلاً معاشیات یا عمرانیات کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کارتھیج، روم اور میلان میں مختلف تعلیمی اداروں میں معلم کی حیثیت میں کام کرتا رہا۔ اس کی مشہور کتاب "اعترافات" (CONFESSIONS) اس زمانے کی مذہبی زندگی کا بہترین نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس نے اس میں اپنی ذہنی کشمکش کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور اس معاملے میں اسلامی تصوف کی تاریخ میں غزالی کی 'منقذ' کے ہم پلہ ہے۔

اس کی علمی زندگی کافی متنوع اور دلچسپ تھی۔ لاطینی زبان سے پوری طرح واقف تھا لیکن یونانی زبان سے مانوس نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں علمی تحقیق کا جذبہ سسرو کی ایک کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوا اور زندگی کے آخری دنوں تک برقرار رہا۔ اسی جذبے کے تحت وہ زندگی کے مختلف دوروں میں مختلف مذاہب اور فلاسفہ کا مطالعہ کرتا رہا اور یکے بعد دیگرے مختلف عقاید کی سچائی کا قائل رہا۔ لیکن اس علمی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی عملی زندگی کسی طرح قابل رشک نہیں تھی۔ اس کی نیک ماں کی عملی مثالیں اور اس کی پرجوش دعائیں اس کو نیکی کی طرف مائل نہ کر سکیں اور اس نے بوالہوسی کی زندگی شروع کر دی۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے ایک عورت کو بغیر نکاح کے گھر میں ڈال لیا۔ اس دور کی زندگی کے متعلق وہ اعترافات میں لکھتا ہے: "میں کارتھیج پہنچا۔ یہاں ہر طرف سے میرے کانوں میں ناپاک محبتوں کے خوفناک نغموں کی گونج پہنچ رہی تھی۔ ابھی تک میں نے کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن محبت کرنے کا جذبہ میرے دل میں موجزن تھا۔۔۔ مجھے اس

قسم کی محبت کا جنون سا ہو گیا اور آخر کار ایک دن مجھے یہ مراد مل گئی اور میں خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ لیکن افسوس کہ، اس طرح میں نے دوستی کے چشمے کو بوالہوسی کی گندگی سے خراب کر دیا۔ اس طرح جس محبت کا میں خواہشمند تھا اس میں گلے گلے تک ڈوب گیا۔" اس عورت سے اسے واقعی بے انتہا محبت تھی اور بعد میں جب ایک خاص موقع پر اسے اس کو چھوڑنا پڑا تو اسے بہت صدمہ ہوا اور کافی مدت تک اس کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ اس تعلق سے اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ہماری زبان میں خداداد یا اللہ دتا کہا جا سکتا ہے۔

آگسٹائن کی تعلیم و تربیت کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ بوالہوسی کے باوجود اس کے دل میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہا۔ ایک دن اسے سسرو (CICERO) کی ایک کتاب کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے پڑھنے سے اس کی طبیعت میں ایک ہیجان نا کیفیت پیدا ہوئی اور اب محض خطابت سے ہٹ کر وہ فلسفے کی طرف متوجہ ہوا اور زندگی کی عام دلچسپیوں اور مادی خواہشات کی طرف سے ایک سرد مہری اور بے رخی سی پیدا ہو گئی۔ "ہر بے کار خواہش فوراً میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی اور اب میرے دل میں لازوال حکمت و دانائی حاصل کرنے کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ یونانی زبان میں حکمت کی محبت کو "فلسفہ" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز تھی جس کی تڑپ اس کتاب نے میرے دل میں پیدا کی۔ اکثر لوگ اسی مقدس اصطلاح کے پردے میں اپنی گمراہیوں اور غلط نظریات کی ترویج کرتے ہیں اور اسی لیے اس کتاب میں یہ نصیحت درج تھی کہ خبردار کہیں تم غلط فلسفے اور لوگوں کی ذاتی خواہشات سے متاثر ہو کر گمراہ نہ ہو جانا۔ صحیح حکمت کا منبع مسیح کی ذات ہے کیونکہ اس میں جسمانی طور پر خدا موجود ہے۔"[1] آگسٹائن نے آج تک انجیل کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب اس کو پڑھا جائے لیکن مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان میں کوئی ادبی کمال نہیں بلکہ بالکل معمولی چیز ہے اور اس جیسے بڑے آدمی کے لیے اس کا مطالعہ کرنا بالکل بے معنی سی بات ہو گی۔

اس کے بعد وہ مانوی حلقے میں شامل ہو گیا۔ اور نو سال تک اس مذہب میں شامل رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہوتے۔ فلسفے کی کتابوں کا گہرا مطالعہ وہ مسلسل کرتا رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے زمانے کے سائنسدان اور فلسفی اس کائنات کے متعلق زیادہ صحیح علم رکھتے ہیں اور جن چیزوں کے متعلق مانوی اسے ایمان لانے کے لیے کہتے ہیں وہ کسی طرح بھی صحیح نہیں تو اس کے بعد اس کے عقیدے میں تذبذب پیدا ہونا یقینی تھا۔ اسی دوران میں ایک مانوی مبلغ فاؤسٹس کا رتیج آیا اور آگسٹائن اپنے شکوک رفع کرنے کی خاطر اس سے

---

(۱) کتاب ۳، باب ۴، ۸۔ ص ۳۵۔ ۳۶

ملا۔ وہ اس کی قادرالکلامی اور فنِ خطابت سے ضرور متاثر ہوا۔ اس کی شخصیت میں ایک جذب وکشش ضرور تھی لیکن ان سے اس کے دل کی تاریکیوں میں روشنی پیدا نہ ہو سکی۔ گفتگو کے دوران میں آگسٹائن کو معلوم ہوا کہ وہ عام علوم سے بے بہرہ ہے اور سوائے خطابت اور عمدہ گفتگو کے ایسے مسائل کی پیچیدگیوں سے کوئی واقفیت نہیں۔ جب آگسٹائن نے اس سے مختلف سوالات کرنے شروع کئے تو اس نے صاف گوئی سے تسلیم کیا کہ وہ ان کو حل کرنے اور تشفی بخش جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کی اس صاف گوئی نے آگسٹائن کو متاثر تو ضرور کیا لیکن مانوی مذہب کے متعلق اس کی عقیدت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد آگسٹائن روم چلا گیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہاں کا ماحول اس کے لیے زیادہ سازگار رہے۔ وہاں وہ ایک مانوی دوست کے ہاں ٹھہرا لیکن آہستہ آہستہ یہ اثر زائل ہوتا گیا۔

یہاں سے آگسٹائن کی ذہنی کش مکش کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ روم میں اسے کوئی سازگار ماحول نہ مل سکا اور اس لیے اس کی پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں اس نے بدیوں اور سیہ کاریوں کے وہ خوفناک منظر دیکھے جن کے سامنے کارتھیج کے مناظر بالکل ہیچ تھے۔ میلان میں فنِ خطابت کے لیکچرار کی جگہ خالی تھی اس لیے یہ روم سے میلان جا پہنچا۔ وہ مانوی عقائد سے بالکل دل برداشتہ ہو چکا تھا لیکن ابھی عیسائیت کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ پیدا نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ وہ افلاطون کی اکیڈیمی کے فلسفہ تشکیک کی طرف مائل ہو گیا۔ لیکن محض شکوک و شبہات پر زندگی کی تعمیر مشکل ہوتی ہے اور آگسٹائن جیسے آدمی کے لیے ایسے سلبی نظریہ میں پناہ لینا ناممکن تھا۔ اس کی ذہنی پریشانیاں بہت بڑھ گئیں خاص کر اس وجہ سے کہ وہ ابھی تک اپنے ان دوستوں سے میل جول رکھتا تھا جو مانوی تھے۔

مانی کی تعلیم اس کے دل کو مطمئن تو نہ کر سکی لیکن چند تصورات کا نقش ایسا گہرا تھا جس کی بنا پر وہ عیسائیت کی تعلیم کو قبول نہ کر سکا۔ مانی کے خیالات کے مطابق یہ کائنات اور انسانی جسم دونوں بدی اور شر کے مظہر ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عیسائی تصور کہ خدا انسانی جسم کی شکل میں ظاہر ہو ناقابل قبول نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس طرح خدا کا شر سے ملوث ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مانویوں نے اناجیل پر جو مختلف اعتراضات کئے تھے وہ آگسٹائن کی نظر میں اتنے وقیع اور مدلل تھے کہ ان کا جواب مشکل سے دیا جا سکتا تھا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کوئی ایسا شخص اسے مل جائے جو ان اعتراضات کا صحیح جواب بتا سکے یا ان کو رد کرنے کے طریقے کی طرف راہنمائی کر سکے۔ میلان میں اسے بشپ امبروز کے وعظ سننے کا موقع ملا۔ آگسٹائن اس کی شخصیت سے متاثر ضرور ہوا لیکن اس کا وعظ سنتے وقت وہ اس کی خطابت کے فن کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا۔ لیکن وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مانوی فاؤسٹس امبروز سے بہتر خطیب ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کے مضامین نے اس کے دل پر اثر کرنا شروع کیا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ عیسائیت کے جن عقاید کو وہ ناقابلِ دفاع

سمجھتا تھا ان کی عقلی توجیہ اب اس کے لیے آسان ہو گئی۔ اور مانویوں کے جو اعتراضات اس کے نزدیک مسکت اور مدلل تھے اب وہ بالکل بے معنی اور بے جان ہو کر رہ گئے۔ اس نے اس کے بعد ان دلائل کی تلاش شروع کی جن کی بنا پر وہ مانوی عقاید کے کذب و دروغ کو واضح کر سکے لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا تاہم اس منزل پر اس کا عقیدہ تھا کہ اس کائنات کے متعلق جہاں تک انسانی فہم کی رسائی ممکن ہے مانویوں کے مقابلے میں فلسفیوں کا نقطۂ نگاہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس پر اس نے فیصلہ کیا کہ مانویت کو خیرباد کہہ دیا جائے۔[۱]

اس کے بعد اس کی ماں بھی میلان آ گئی اور اس کے آتے ہی آگسٹائن کے عیسائیت کی طرف جھکنے کا امکان زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل میں عیسائیت اور مانویت کا تقابل کرتے ہوئے یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ اول الذکر میں بہت خوبیاں ہیں۔ تاہم شکوک و شبہات کا سمندر اس کو گرداب میں غوطے دئیے جا رہا۔ "وہ عالم غیب کے متعلق اس طرح کا واضح و یقینی علم حاصل کرنے کا خواہش مند تھا جس طرح کہ سات اور تین مل کر دس بنتے ہیں"[۲] لیکن ایک دفعہ دھوکا کھا لینے کے بعد وہ کوئی نیا قدم اٹھانے سے گھبراتا تھا۔

اس کی ذہنی کشمکش کی شدت اور اس سے پیدا شدہ بے چینی کا اندازہ مندرجہ ذیل دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک دن وہ بادشاہ کے سامنے ایک قصیدہ پڑھنے کے لیے جا رہا تھا کہ معاً اسے خیال آیا کہ محض دنیاوی جاہ و جلال و عزت کی خاطر اس نے جھوٹ کا یہ طومار اکٹھا کیا ہے اور پھر جب وہ اسے بادشاہ کے سامنے پڑھے گا تو ہر طرف سے تعریف و تحسین ہو گی اگرچہ سب لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ سوائے جھوٹ اور خوشامد کے کچھ نہیں۔ اس تصور پر اس کے دل میں غم و غصہ اور پریشانی کی ایسی لہر پیدا ہوئی کہ وہ اپنے دل کو تسلی نہ دے سکا۔ اسی دوران میں اس کی نظر ایک نوجوان فقیر پر پڑی جو بہت خوش اور مطمئن سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے اس ظاہری اطمینان کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک ٹھیس اٹھی۔ جب اس نے اس کی حالت کا مقابلہ اپنی اندرونی کشمکش سے پیدا شدہ پریشانیوں سے کیا تو وہ اس کی تشریح کرنے سے قاصر تھا۔ اس وقت اسے اپنی زندگی کی ناکامی اپنی آرزوؤں کی پامالی اور ہر ہر قدم پر مصیبتوں کے پہاڑوں سے مقابلہ کرنے سے ذہنی اور دماغی کوفت کا شدید احساس ہوا۔ لیکن سوال جو ابھر کر اس کے سامنے آ رہا وہ یہی تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ کون سا راستہ اختیار کرے جس سے اسے پناہ مل سکے اور اس کے قلب کو سکون میسر آ سکے؟

لیکن دوسری طرف وہ اس مادی زندگی کی دلدل میں بری طرح گرفتار تھا۔ اس کا قلب نجات و سکون کا

---

(۱) اعترافات کتاب ۵، ص ۹۰، ۹۲ (۲) ص ۱۰۰، باب ۶

خواہشمند تھا لیکن دنیاوی جاہ وجلال اور جسمانی ہوس رانیوں کی کشش سے دست بردار ہونا بھی اس کے لیے مشکل تھا۔ اس کی والدہ نے خواہش کی کہ اس کی باقاعدہ شادی کردی جائے تاکہ وہ گناہ کی زندگی سے محفوظ ہو جائے۔ وہ تیار ہوگیا اور اس نے اپنی غیر منکوحہ بیوی کو علیحدہ کر دیا اگرچہ اسے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ لیکن جب شادی جلدی نہ ہوسکی تو اس نے کسی دوسری عورت سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔ وہ ہوس کا شکار تو ہوگیا لیکن اس کی روح اس عمل سے بغاوت کر رہی تھی اور اس طرح اس کی ذہنی کش مکش میں اور اضافہ ہوگیا۔

اس منزل پر اس کا ایک عزیز شاگرد الی پیس اور ایک دوسرا شخص نبری ڈیس اس کے ساتھ رہنے لگے۔ ان تینوں میں مشترک جذبہ تلاش حق تھا۔ جب کبھی انہیں فرصت ملتی وہ اکٹھے بیٹھ کر صداقت کی تلاش میں سرگرداں بحث کرتے رہتے۔ مانوی اثر کے ماتحت اس کے ذہن میں خدا تصور جسمانیت سے ملوث تھا۔ اس سے اس نے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کیا ہوسکتا ہے؟ اتنا واضح تھا کہ خدا کی ذات ہر قسم کے تغیر و زوال سے بالا ہے۔ لیکن کیا وہ اس کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے یا اس کا وجود اس سے ماورا ہے؟ وہ خدا کو اس مکانیت سے علیحدہ متصور نہ کرسکا۔ دوسرا تصور جس کے متعلق اس کا ذہن ابھی صاف نہیں ہوا تھا وہ شر کا وجود تھا۔ اس شر کا صدور کہاں سے ہوا؟ مانوی عقاید سے توبہ کرنے کے بعد اب اس کے لیے اس مسئلہ کا حل بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ کیا خدائے مطلق پر اس کی ذمہ داری عائد کی جاسکتی ہے؟

شاید اس شر کا باعث ہمارا اختیار ہے۔ جب ہم اپنے نفس کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے بعض دفعہ نیکی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور بعض دفعہ بدی کا اور اسی سے شر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کس نے بنایا؟ خدا نے جو خیر محض ہے تو پھر یہ شر کا جذبہ کس طرح پیدا ہوا؟ اگر ابلیس ذمہ دار ہے تو ابلیس کو بھی تو خدا نے ہی بنایا تھا۔ اس میں شر کا عنصر کیسے پیدا ہوگیا؟ کیا خدا قادر مطلق نہیں؟ ممکن ہے کہ شر کا وجود ہی نہ ہو اور ہم محض ایک تخیل کے پیچھے سرگرداں ہوں۔ انہی الجھنوں میں آگسٹائن کافی عرصہ مبتلا رہا۔[1]

اسی کش مکش کے دوران میں اسے فلاطینوس اور دیگر نو افلاطونی فلاسفہ کی کتب کے مطالعہ کا موقع ملا۔ مانویت کی ثنویت کے مقابلہ میں یہاں وحدانیت تھی۔ ان کتابوں سے وہ بہت متاثر ہوا اور چونکہ ان فلاسفہ کا نظریہ عیسائیت کے تصورات سے بہت مشابہ تھا اس لیے اس کا ذہن عیسائیت کی طرف زیادہ مائل ہوگیا۔ چنانچہ وہ بیان کرتا ہے کہ میں نے ان کتابوں میں پڑھا (اگر لفظاً نہیں مگر معناً) کہ "ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے

---

(۱) اعترافات، کتاب ۷، ص ۱۲۱-۱۲۵

ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔ اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھی۔ اور نور تاریکی میں چمکتا ہے اور تاریکی نے اسے قبول نہ کیا۔ لیکن یہ مفہوم جو انجیل یوحنا میں مندرج ہے اسے ان کتابوں میں نہ ملا کہ "وہ اپنے گھر آیا اور اس کو انہوں نے قبول نہ کیا۔ لیکن جتنوں نے اسے قبول کیا اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا (۱: ۱۱-۱۲) اسی طرح یہ تصور بھی اسے ان فلاسفہ کی کتابوں میں ملا کہ "وہ نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے نہ انسان کے ارادے سے بلکہ خدا سے پیدا ہوا" (یوحنا ۱، ۱۳) لیکن یہ تصورات ان کے ہاں موجود نہ تھے کہ "کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا" (یوحنا ۱، ۱۴)[۱]۔

دوسرے الفاظ میں آگسٹائن کو ان فلاسفہ کے ہاں کلمہ (LOGOS) کا مابعد الطبیعی نظریہ تو مل گیا لیکن حلول اور اس کے ساتھ وابستہ نجات کے تصورات وہاں نہ مل سکے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ مانوی اثرات کے ماتحت خدا کا مادی تصور اس کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب اس کے سامنے خدا کی ذات نور اور زندگی کے تصورات سے وابستہ ہو گئی — ایسا نور جو مادی نور کے مماثل نہیں بلکہ وہ نور جس کو صرف انسان کا دل سمجھ سکتا ہے۔ اس تجربے کے بعد اسے کچھ اطمینان سا ہوا۔ اس کے بعد اس نے انجیل کی مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور خاص طور پر پولوس کا۔ اس مطالعہ کے دوران میں اس کی وہ اجنبیت جو وہ پہلے ان کتابوں میں محسوس کیا کرتا تھا دور ہو گئی۔

پادری امبروز کی جگہ ایک دوسرا بزرگ سمپلی کیانس آیا ہوا تھا۔ آگسٹائن اس کے پاس پہنچا اور اپنی داستان سنائی۔ جب اس نے اپنا تجزیہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ جاہ و ہوس اور دنیاوی عزت کی خواہش اب

---

(۱) یوحنا کی انجیل۔ ۱، ۱-۶ یہ تمام تصورات جن کی طرف آگسٹائن اشارہ کرتا ہے کہ وہ اسے نو افلاطونی فلاسفہ کی کتابوں میں ملے اور جن میں سے کچھ انجیل یوحنا میں بھی موجود تھے، درحقیقت عیسائیت اور نو افلاطونی فلاسفہ کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ اس زمانے کے دیگر مشرکانہ مذاہب اور باطنی اسرار میں سب جگہ پائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض کا خیال ہے کہ آرفیسی نظام فکر میں بھی موجود تھے۔ جیسا کہ بعض ناقدین کا خیال ہے یہ تصورات حضرت عیسیٰ کی صحیح تعلیم کا جزو تھے ہی نہیں بلکہ بعد میں مختلف لوگوں نے جب اناجیل تیار کیں تو اپنے زمانے کے نظریات اور تصورات کو اختیار کر کے عیسائیت میں ان کو داخل کر دیا (مثلاً گیبرٹ، عہد جدید میں یونانی تصورات)۔ چنانچہ ماننا پڑے گا کہ جس عیسائیت کو آگسٹائن نے قبول کیا وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے زیادہ اپنے ہم عصر فلسفیوں اور مذاہب کا آمیزہ تھا۔

اس کے دل میں موجود نہیں لیکن عورت کی محبت ابھی اس کے حواس پر سوار ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کے دل میں راہ راست پر آنے کی تڑپ زور دور پر تھی۔ سمپلی کیانس نے اسے ایک شخص وکٹورینس کا قصہ سنایا جو روم کے باشندوں میں بہت زیادہ قابل عزت و تکریم سمجھا جاتا تھا۔ اور عوام کو اس سے عقیدت تھی لیکن اس نے ایک دن گرجا میں جاکر سب لوگوں کے سامنے عیسائیت قبول کرلی۔ اس کا اعلان ہیجان انگیز ثابت ہوا۔ رومی سلطنت کے عوام کے غصے اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن اس شخص نے ان میں سے کسی چیز کی پرواہ کرتے ہوئے اپنے عیسائی ہونے کا اعلان کردیا۔ آگسٹائن کے لیے یہ واقعہ عبرت آموز ضرور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح اپنی عیسائیت کا اعلان کردے۔ لیکن جب اس نے سنا کہ رومی سلطنت نے ایک قانون نافذ کیا ہوا ہے کہ کوئی عیسائی خطابت یا دوسرے رومی علوم کے لیکچرار کے طور پر ملازم نہیں رکھا جاسکتا تو اس کا جذبۂ تبدیل مذہب سرد پڑ گیا۔ اس کے سامنے ایک طرف خدا کی رضا جوئی تھی اور دوسری طرف اپنی ملازمت اور تنخواہ تھی۔ اس دوراہے پر آکر اس کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ جب اسے آواز آئی کہ "میری طرف لپکو" تو اس نے کہنا شروع کیا کہ "ابھی نہیں"۔ "مجھے تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیجئے" لیکن بقول اس کے یہ "ابھی نہیں" کبھی ختم ہونے والی نہ تھی اور یہی کش مکش اس کے قلب پر طاری رہی۔

ایک دن ان کا ایک ہم وطن شخص ان سے ملنے آیا۔ وہ شاہ روم کے دربار میں ایک بلند منصب پر فائز تھا لیکن وہ عیسائی ہوچکا تھا۔ اس نے جب آکر آگسٹائن کی میز پر غلاف توقع پولوس رسول کے صحیفوں کی کتاب دیکھی تو اس نے چند ان عیسائی راہبوں اور ان لوگوں کے جنہوں نے عیسائیت قبول کرتے وقت انتہا درجے کی مصیبتوں میں پامردی کا ثبوت دیا تھا دلچسپ قصے سنانے شروع کئے جن سے وہ بہت متاثر ہوا۔ ان کے مقابلہ پر اسے اپنی کوتاہیاں اور کمزوریاں بہت نمایاں نظر آنے لگیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے عزیز شاگرد الی پیس (ALYPIUS) کے ساتھ بیٹھ کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جن لوگوں کے حالات اس نے سنے تھے وہ علمی طور پر جاہل تھے۔ لیکن حقیقت کی روشنی تک پہنچنے میں وہ آگسٹائن جیسے دانا لوگوں سے کہیں زیادہ آمادہ تھے۔ اسے علمی بلندی اور روحانی غربت کے تضاد پر تعجب ہوا۔ اس کے قلب میں ایک عجیب احساس ندامت، عجز، اور شرمندگی نمودار ہوا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے غرور کے پردے ہٹے۔ اور اسے اپنی حقیقی کمزوری کا احساس ہوا۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو علم و عقل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا محسوس کرتا تھا اور اسے یہ توقع تھی کہ وہ دلائل عقلی دلائل سے حقیقت تک پہنچ سکے گا لیکن جب اس نے دیکھا کہ جاہل ترین انسان اس سے کہیں جلدی اس حقیقت کو پالینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو اسے ندامت کا شدید احساس

ہوا۔ اب اس نے اپنے شاگرد الی پیس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "کیا ہمیں اس بات پر شرم آنی چاہیئے کہ دوسرے ہم سے پہلے اس حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔" یہ فقرہ اس بات کا اعلان تھا کہ اس میں علمی غرور اور عقلی تکبر ختم ہو چکا ہے اور اب وہ سچائی کو اپنانے کے لیے تیار تھا۔ تاہم اس کی اندرونی کش مکش اور نفسی تگ و دو جاری تھی۔

وہ اپنے مکان سے ملحقہ باغ میں جا بیٹھے۔ آگسٹائن اور الی پیس دونوں پاس پاس بیٹھے تھے۔ لیکن آگسٹائن کے دل میں ایک مکمل جنگ جاری تھی۔ ایک طرف دنیاوی لذت، جاہ و منزلت تھی۔ ہوس رانیاں اس کو مسلسل دعوت دے رہی تھیں کہ اگر اس نے یہ راستہ اختیار کر لیا تو وہ ہمیشہ کے لیے ان لذتوں سے محروم رہ جائے گا۔ لیکن دوسری طرف نیکی، بھلائی اور عفت کی دیویاں اس کو سمجھا رہی تھیں کہ ہزاروں نوجوان مردوں اور عورتوں نے اپنے آپ کو اس زندگی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ کیا تم میں اتنی جرأت نہیں؟ یہ جنگ اس کے نفس میں جاری تھی اور الی پیس اس سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوا اس تمام ماجرے کے اختتام کا منتظر تھا۔ اچانک یہ جذبات امڈ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دور ایک انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر رونا شروع کیا۔ "اے خدا! کب تک؟ کب تک یہ غصہ و خفگی؟ اے خدا! میرے پرانے فسق و فجور قابل معافی ہیں! کب تیری بخشش کا آغاز ہو گا؟ کل؟ آج کیوں نہیں؟" ایسے الفاظ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلتے گئے۔ اسی حالت میں ایک ساتھ والے مکان سے کسی لڑکے یا لڑکی کی زبان سے یہ الفاظ بار بار سنائی دیئے۔ "اٹھ اور پڑھ، اٹھ اور پڑھ۔" ان الفاظ کو سن کر اس نے رونا بند کر دیا اور اٹھ کر واپس اس جگہ آیا جہاں وہ پہلے الی پیس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں پولوس رسول کا صحیفہ پڑا ہوا تھا۔ اس کو اٹھایا، کھولا اور پہلے جس جگہ نظر پڑی وہاں یہ فقرات تھے:

بدمستی اور شراب خوری میں نہیں اور نہ حسد و فساد میں بلکہ مسیح کو لباس اور ھنا بھو ناباؤ اور نفسانی خواہشات کی طرف توجہ نہ کرو" (پولوس کا خط رومیوں کے نام)

"اس سے آگے میں نے نہیں پڑھا اور نہ مجھے ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کے ختم ہوتے ہی ایک قسم کا نور اور روشنی میرے سینے میں سرایت کر گئی اور میرے دل سے تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے۔"(۲) اس تبدیلی اور انقلاب کی خبر جب اس کی والدہ کو ملی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جو بے چاری اسی انتظار میں تھی اور چند دنوں کے بعد چل بسی۔

اس کے بعد آگسٹائن نے کچھ مدت تنہائی اور ریاضت میں بسر کی اور بقایا عمر اس نے اپنی علمی استطاعت کے مطابق عیسائیت کی خدمت میں صرف کر دی۔ صدیوں تک عیسائی دینیات آگسٹائن کے اثر سے آزاد نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہاں ہمارا مقصد عیسائی دینیات کی تاریخ پیش کرنا نہیں تاہم آگسٹائن نے جو کچھ عیسائی تصوف کے سلسلے میں کام کیا ہے اس کا صحیح جائزہ لینے کے لیے اس کے دینیاتی نقطہ نظر کی وضاحت ضروری ہے۔

---

(۱) اعترافات، ص ۱۹۳، کتاب ۸، باب ۸-۱۹ (۲) اعترافات، کتاب ۸، باب ۱۲، ۲۹، صفحہ ۱۷۱

آگسٹائن کے قلب و ذہن میں گناہ کا تصور کچھ اس طرح حاوی نظر آتا ہے کہ آخری عمر تک وہ اس سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ اس کی کچھ وجہ تو مانوی اثرات ہیں اور کچھ اس کی اپنی زندگی کا تجربہ"۔ اور یہی وجہ تھی کہ آخر تک اس کی زندگی اور اس کے نظریات سے مایوسی اور قنوطیت کی جھلک آتی رہی۔ ہیلاگیوس کے ساتھ مباحثہ کرتے ہوئے آگسٹائن نے جو موقف اختیار کیا اس سے اس کے نظریات پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں۔ یہ جھگڑا در حقیقت جبر و قدر کے متعلق تھا۔ پیلاگیوس ایک برطانوی پادری تھا جس کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ خدا اصلاً عادل ہے اور اس لیے اس نے ہر چیز کو نیک پیدا کیا۔ چنانچہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نیک ہے اور اس لیے فطری گناہ کوئی چیز نہیں۔ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی طرح معصوم ہوتا ہے جس طرح آدم اپنی لغزش سے پہلے تھے۔ پیلاگیوس کا خیال تھا کہ نہ صرف یہ کہ آدمی اس زندگی میں گناہ کی آلودگی سے پاک رہ سکتا ہے، بلکہ ایسے آدمی ہو گزرے ہیں جو بالکل معصوم زندگی بسر کرتے رہے۔

۲۔ انسان کا علو مرتبت اس کی عقل اور اختیار میں مضمر ہے۔ اسے نیکی اور بدی دونوں کا راستہ دکھا دیا گیا ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی قوت بھی اس میں موجود ہے۔

۳۔ نفسانی خواہشات کسی حیثیت میں بھی شر انگیز نہیں کہلا سکتیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص ان خواہشات کو پورا کرتا ہے تو وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ گناہ تو حد اعتدال سے تجاوز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ شادی اپنی ذات میں گناہ کا موجب نہیں۔

۴۔ آدم کی لغزش کا باعث اس کے اختیار کی آزادی ہے اور دوسرے انسانوں کی لغزشیں بھی اسی باعث سے پیدا ہوتی ہیں۔ موت کسی طرح بھی گناہ کا نتیجہ نہیں اور نہ آدم کی لغزش کا کوئی اثر باقی انسانوں کی فطرت پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

---

(۱) اعترافات (کتاب ۲، باب چہارم) میں وہ اپنے بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے جب اس نے چند ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ ہمسائے کے ناشپاتیوں کے درخت کو بلا وجہ برباد کر دیا حالانکہ انہیں ناشپاتیوں کے کھانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اسے گھر میں بڑی آسانی سے بہتر ناشپاتیاں میسر آسکتی ہیں۔ اگر اسے بھوک ہوتی یا اسے کسی اور طریقے سے ناشپاتیاں حاصل نہ ہوسکتیں تو البتہ اس کے اس فعل کا جواز ہو سکتا تھا۔ اس تنقید کے بعد آگسٹائن اپنی رائے کا اظہار یوں کرتا ہے کہ: شاید انسان کی فطرت میں گناہ، بدی اور شرارت اس طرح رچی ہوئی ہے کہ بلا وجہ اور بلا مقصد اس سے یہ کام سرزد ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس آگسٹائن کا خیال تھا کہ انسان فطری طور پر گناہ گار پیدا ہوا ہے اور صرف خدا کی بخشش سے اس کی نجات ممکن ہے۔ اگر معصوم بچوں کو بپتسمہ نہ دیا جائے تو وہ موت کے بعد ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ جو خطوط آگسٹائن اور افریقہ کے دوسرے پادریوں نے پیلاگیوس کے موقف کے خلاف پوپ کو لکھے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگسٹائن کے نزدیک اگر پیلاگیوس کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے یعنی اگر ہم مان لیں کہ انسان میں فلاح پانے کی فطری صلاحیت موجود ہے تو اس سے بپتسمہ دینے کی رسم بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور مسیح کی تمام زندگی کا مقصد یعنی انسانوں کو گناہ سے پاک کرنا بالکل ختم ہو جائے گا۔

زوال آدم اور گناہ فطری کا یہ مسئلہ جس کو آگسٹائن کے باعث عیسائی کلیسا نے اختیار کیا درحقیقت انسانیت کے لیے ایک عظیم الشان بدقسمتی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کافی مدت تک لوگوں کے ذہن پر ناامیدی اور قنوطیت طاری رہی جس سے انسانوں کی تخلیقی قوت بری طرح مجروح ہو گئی۔ بعد میں اسلام نے جو نیا پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا اس کا ایک پہلو عیسائیت کی اس آگسٹائنی تعبیر کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ یہ اسی تعبیر کا نتیجہ تھا کہ عیسائیوں میں ناامیدی کے باعث رہبانیت کا رواج عام ہو گیا۔ انسانی جسم کے فطری تقاضوں اور جائز نفسانی خواہشات کی تسکین کو گناہ سمجھا جانے لگا۔ شادی کے مقابلے میں تجرد کی زندگی کو ترجیح دی جانے لگی۔ معاشرتی اور تمدنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی بجائے جنگلوں اور ویرانوں میں پناہ لینا پسند کیا جانے لگا۔ اسی بنا پر قرآن نے عیسائی راہبوں کی تعریف کرتے ہوئے بھی رہبانیت کو بطور نظریۂ حیات مسترد کر دیا اور انسان کے قلب و ذہن کو فطری گناہ کے خوفناک تصور کی ہولناکیوں سے پناہ دی۔

ان دینیاتی مناظروں میں منہمک ہونے کے باوجود آگسٹائن کا مقام تصوف میں بہت بلند ہے۔ اس کی زندگی سے تصوف کے متعلق بعض غلط فہمیاں رفع ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ تصوف قانون و شریعت کی پابندی کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ دین انسانوں سے چند ظواہر کی پابندی کا طالب ہے لیکن تصوف اس کے برعکس خدا سے بلا واسطہ رابطہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسی لیے طریقت اور شریعت کے مابین نزاع کی بنیاد پڑتی ہے۔ مذہب و فلسفہ کا دار و مدار زیادہ تر عقلی مباحث پر ہوتا ہے اور تصوف عموماً انسان کی جذباتی زندگی کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ لیکن آگسٹائن کی متنوع زندگی ایسی جامع تھی کہ ایک طرف وہ شریعت و عقل کا نمائندہ ہے تو دوسری طرف وہ طریقت و عشق کا بھی ویسا ہی پُرجوش حامی ہے۔ ایک حیثیت میں وہ کلیسا کے اقتدار مطلق کا متعصب علمبردار ہے تو دوسری طرف وہ انسان کے خدا سے بلا واسطہ ربط پیدا کرنے کی اہلیت کا نہ صرف نظری طور پر حامی بلکہ جس کی اپنی ساری زندگی اس کی تائید

کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ صوفی بھی تھا اور فقیہہ بھی اور اسی جامع حیثیت کے باعث عیسائیت کی تاریخ میں اس کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔

آگسٹائن نے انسانی زندگی کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول وہ زندگی جس میں انسان اپنا تمام تر وقت مسلسل جدوجہد و سعی تگ و دو میں صرف کرتا ہے۔ یہ زندگی کا فعّال پہلو ہے۔ دوسرے وہ زندگی جس میں انسان اپنا وقت مشاہدات، ریاضت و مراقبات میں صرف کرتا ہے۔ ان دونوں زندگیوں میں سے کونسی زندگی بہتر ہے؟ تصوف کی تاریخ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آخری زندگی جدوجہد کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اور صوفیا نے مختلف دلائل سے اس کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بائیبل میں ان دونوں زندگیوں کو تمثیلاً مارتھا اور میری دو عورتوں کی زندگی سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی تمثیل سے آگسٹائن فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا فرق بیان کرتا ہے۔ مارتھا نے دنیاوی زندگی اختیار کی اور میری نے جذب و مشاہدات کی زندگی۔ چنانچہ آگسٹائن کہتا ہے: "مارتھا نے ایک اچھا راستہ منتخب کیا لیکن میری نے اس سے بہتر طریقے کو اپنایا۔ جن چیزوں کی طرف مارتھا نے توجہ کی وہ فنا ہونے والی ہیں۔ اس نے بھوکوں، پیاسوں اور محتاجوں کی خدمت کی لیکن یہ سب معاملات قابل فنا ہیں۔ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب نہ بھوک ہوگی نہ پیاس، نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا اور مارتھا کی تمام پسندیدہ کوششیں ختم ہوجائیں گی۔ اس کے بالمقابل میری کا فعل و عمل ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اس نے اپنے لیے مشاہدۂ رب کا راستہ اختیار کیا اور خدا کی ذات ناقابل فنا ہے۔" چنانچہ آگسٹائن کے نزدیک جذب و مشاہدہ کا راستہ انسانی زندگی کا بہترین اور بلند ترین مقصد ہے۔ لیکن چونکہ انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس لیے فطری طور پر وہ اس نصب العین تک مکمل طور پر نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ آگسٹائن نے اپنے اس نظریے میں ترمیم کرکے، انسانی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول جذب و مشاہدہ کی زندگی۔ دوسرے عمل کی زندگی۔ تیسرے ایسی زندگی جس میں یہ دونوں اجزا شامل ہوں۔ اس کے نزدیک تیسری قسم کی زندگی ہر انسان کے لیے ممکن ہے اور یہی وہ زندگی ہے جس پر وہ خود عمل پیرا ہوتا رہا۔

مشاہدۂ ذات خداوندی یا دیدار ذات آگسٹائن کے نزدیک انسان کی اخلاقی زندگی کا بہترین ثمرہ ہے جس کا وعدہ خدا نے اپنے نیک بندوں سے کیا ہے۔ اگرچہ یہ اجر حقیقی معنوں میں صرف موت کے بعد کی زندگی میں ممکن ہے۔ لیکن اس دنیا میں بھی نیک آدمیوں کو اس روحانی لذت سے کچھ بہرہ ملتا ہے اگرچہ وہ عارضی اور وقتی ہی کیوں نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آگسٹائن کے نزدیک شدید ریاضت اور نفس کشی کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاذ حالتوں میں مشاہدۂ ذات ایسے شخص کو

نصیب ہو سکتا ہے جس نے مطلوبہ زہد و ریاضت کی طویل منزلیں طے نہ کی ہوں لیکن عام حالتوں میں اس سلوک کے بغیر یہ نعمت حاصل نہیں ہوتی۔ عام طور پر عیسائی تصوف میں اس سلوک کی تین منازل کا ذکر آتا ہے: صفائی قلب (PURGITION) مشاہدۂ نور (ILLUMINATION) اور وصل (UNION)۔ یہی تینوں مراتب آگسٹائن کے ہاں مختلف اصطلاحات کی شکل میں موجود ہیں۔ اس کے خیال میں روح انسانی سات مختلف مرتبوں سے گزرتی ہے پہلے چار درجوں میں روح کا تعلق حیات، حواس، عقل اور اخلاق سے ہوتا ہے۔ پانچویں درجے میں نفسانی خواہشات کا زور اور ہیجان سکون پذیر ہو جاتا ہے۔ چھٹے درجے میں انسان میں مشاہدۂ ذات کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور آخری درجے میں اسے مشاہدہ ذات کا تجربہ ہوتا ہے۔ آگسٹائن کے خیال میں چوتھا درجہ صفائی قلب کا ہے جہاں نفسانی خواہشات پر قابو پا لیا جاتا ہے۔ پانچویں میں اس کی مکمل اصلاح ہو جاتی ہے۔ چھٹے میں وہ اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے اور خدا کی بخشش کے باعث وہ آخری اور بلند ترین منزل کی طرف رواں دواں روانہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے ساتویں درجے میں وہ نعمت عظمیٰ نصیب ہو جاتی ہے جس کی خاطر اس نے سلوک کی یہ تمام منزلیں طے کی تھیں۔

اس سلوک کے لیے آگسٹائن نے خاص طور پر دو چیزوں پر بہت زور دیا ہے یعنی ذکر اور توجہ علی القلب اس کا مفہوم یہ ہے کہ دل سے ماسوا اللہ کے تمام خیالات کو خارج کر دیا جائے۔ عقل و استدلال کے تمام طریقوں کو ذہن سے برطرف کر دیا جائے اور اس طرح پوری یکسوئی حاصل کر کے قلب کی توجہ اپنے داخلی معاملات پر مرکوز کر دی جائے۔ اسی طریقے سے انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ مشاہدۂ ذات کا پُرسرور تجربہ حاصل کر سکے۔ اس تجربے کے بعد انسان کا دل کلی طور پر اس دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق آگسٹائن کہتا ہے: "جب یہ مشاہدہ اب نصیب ہوتا ہے تو ہمیں اس دنیا کی ساری زندگی اور تمام اشیا ہیچ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس وقت ہمیں احساس ہوتا ہے کہ دین نے جو احکام پیش کیے ہیں اور عقاید و ایمان کے جو اصول بیان کیے ہیں وہ کتنے صحیح اور ضروری ہیں۔ ہمیں اپنے جسم کی حقیقت کا ایسا علم حاصل ہو گا کہ موت کے بعد حشر اجساد پر اس کا یقین ایسا ہی پختہ ہو گا جس طرح کل سورج کے نکلنے کا۔ حلول اور مسیح کے بے باپ پیدا ہونے کے عقاید اس طرح واضح معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ان پر مخالفوں کے اعتراضات بے وزن رہ جاتے ہیں۔ اس مشاہدۂ حق میں وہ لذت و سرور، پاکیزگی و حلاوت اور ایسا پختہ ایمان مضمر ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم جس کو ہم آج تک صحیح علم سمجھے ہوئے تھے علم نہیں تھا بلکہ جہالت تھی اور صحیح علم کے نور سے ہم صرف اب واقف ہوئے ہیں۔ موت کا ڈر دل سے بالکل خارج ہو جاتا ہے اور طبیعت میں یہی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ موت کو جلد از جلد لبیک کہا جائے۔"

سب صوفیا کا یہ متفقہ نظریہ ہے کہ اس شعور ذات کے بعد زندگی کے تمام مشکل مسئلے اور لاینحل گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور انسان کے لیے اس پختہ بنیاد پر عمل کی عمارت تیار کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

صوفیا کے ہاں یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ آیا مشاہدۂ حق اس دنیا میں ممکن ہے یا نہیں۔ اکثر کی یہی رائے ہے کہ ایسا مشاہدہ ممکن نہیں بلکہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ محض تمثیل یا تجسیم ہوتی ہے جو انسانی تخیل خود پیدا کرلیتا ہے۔ آگسٹائن نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے حضرت موسیٰ اور پولوس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ دونوں نے خدا کا مشاہدہ اس دنیا میں کیا ہے۔ اور اس نعمت عظمے کا حصول ہر نیک آدمی کے لیے ممکن ہے۔

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

"... کتاب محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے اور بڑی معلومات افزا ہے۔ موضوع کی خشکی کے باوجود انداز بیان میں شگفتگی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے اردو میں ایک سنجیدہ اور مفید علمی کتاب کا اضافہ ہوا۔" (معارف اکتوبر ۱۹۵۹ء)

"یہ فلسفہائے اخلاق کا نرا بیان ہی نہیں بلکہ ایک مبصرانہ جائزہ ہے جس میں مصنف نے بڑی عالمانہ نظر، ناقدانہ تنقید اور فن سے گہری مناسبت کا ثبوت دیا ہے۔" (الفرقان لکھنؤ ذیقعدہ)

"علمی حیثیت سے یہ کتاب بلاشبہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جس کے لیے مصنف موصوف دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔" (دالعلم کراچی جنوری مارچ ۱۹۵۹ء)

قیمت چھ روپے

سرگذشت غزالی

مولانا محمد حنیف ندوی

امام غزالی کی "المنقذ" کا اردو ترجمہ

امام غزالی نے اس میں اپنے فکری و نظری انقلاب کی نہایت دلچسپ داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انہوں نے جبہ و عبا اور مسند و دستار کی زندگی چھوڑ کر گلیم و فقر کی روش اختیار کی ہے اور اپنے لیے تصوف کو بطور آخری نصب العین کے اختیار کیا ہے۔ فاضل مترجم نے اپنے مبسوط مقدمہ میں امام غزالی کی عظمت و اہمیت کو نکھار کر فکر و بصر کے سامنے پیش کردیا ہے۔

صفحات ۲۰۰۔ قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ: سکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور